کلیم اختر

اقبالؒ اور مولانا انور شاہ کاشمیریؒ

مولانا انور شاہ کاشمیری خطۂ کشمیر کے ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو مدت دراز سے اپنی دین داری، پرہیزگاری اور حبِ اسلام کی وجہ سے وادی بھر میں ممتاز اور معروف تھا۔ آپ کے جدِ امجد شیخ مسعود زروری مغلوں کے زمانہ میں سرینگر سے ہجرت کرکے ولاب کی پرسکون اور خوبصورت وادی میں اُٹھ آئے اور گردونواح کے بسنے والوں کو مذہبی اور دینی تعلیم دینے لگے۔!

مولانا انور شاہ، شیخ مسعود زروری کی ساتویں پشت میں تھے۔ آپ کے سوانح نگار حضرت مولانا یوسف بنوری "نفحۃ العنبر" میں لکھتے ہیں:

"آپ کا خاندان بغداد سے ہجرت کرکے برصغیر ہند و پاکستان آیا اور تھوڑے عرصہ ملتان اور لاہور میں قیام کرکے آخر کار کشمیر میں سکونت پذیر ہوگیا۔ چنانچہ آپ کی ولادت سے کافی عرصہ پہلے سے یہ خاندان کشمیر میں رہ رہا ہے۔ وہیں کے ایک قریہ دودھواں (ولاب) کو آپ کے مولد ہونے کا شرف حاصل ہوا۔"

مولانا انور شاہؒ ۲۷ شوال ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت میں آپ کے والد محترم محمد معظم شاہ بن عبدالکبیر کا بہت ہاتھ تھا۔ انھوں نے خود ابتدائی تعلیم دی اور قرآنِ حکیم بھی پڑھایا۔ چنانچہ چھ برس ہی کی عمر میں آپ نے قرآنِ مجید حفظ کر لیا اور ساتھ ہی ساتھ زبانِ فارسی کے چند رسائل بھی پڑھ لیے۔ آپ کی ذہنی اور علمی تعلیم و تربیت اور علومِ شرقیہ سے آگاہی میں مولانا عبدالجبار جندل اور مولوی غلام محمد کا بھی حصہ ہے۔ اوّل الذکر فارسی کے عالم اور شاعر تھے اور مؤخر الذکر زبانِ عربی اور علومِ فارسی کے علاوہ دینی مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان اساتذہ کی صحبت نے مولانا کے دل میں مزید علم حاصل کرنے کا شوق پیدا کیا اور پھر یہی شوق انھیں وطن کی بہاروں سے وداع کرکے دیارِ غیر میں لے گیا۔

مولانا انور شاہ نے سب سے پہلے کاکول (ہزارہ) میں قیام کیا۔ یہاں کے مختلف علماء کرام سے علم صرف و نحو اور منطق کے ابتدائی اسباق پڑھے۔ یہ زمانہ تھا جب برصغیر کی فضائیں حضرت مولانا محمود الحسنؒ کے درس و مواعظ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے خطبات سے گونج رہی تھیں۔ دارالعلوم دیوبند

کے چرچے زبان زد خواص و عام تھے۔ اس علمی و دینی ادارہ کی کشش نے مولانا کو ۱۳۰۸ھ میں سترہ برس کی عمر میں دیوبند کھینچ لیا۔

دیوبند میں مولانا انور شاہ ایک مفلوک الحال اور مفلس طالب علم کی حیثیت سے مولانا مشیت اللہ بجنوری مرحوم کے ساتھ رہے۔ بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر آپ نے ہمت نہ ہاری اور نہایت صبر و تحمل سے تحصیل علم میں مصروف رہے اور جب بقول مولانا محمد الدین فوق: اہل دیوبند کو گودڑی کے اس لعل کی بابت معلوم ہوا کہ یہ سنگریزہ نہیں بلکہ لعلِ بدخشاں ہے تو وہ ان کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھنے لگے" آپ نے چار برس کی باقاعدہ تعلیم اور مشاہیر مشائخ عصر کی بابرکت صحبتوں کے طفیل نمایاں شہرت و عزت کے ساتھ سندِ فراغ حاصل کی۔ اس وقت آپ کی عمر صرف بیس یا اکیس سال تھی۔ دارالعلوم دیوبند میں جن علما و فضلا نے آپ کی دینی، علمی اور عملی تربیت میں حصہ لیا ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

شیخ الحدیث مولانا محمود الحسن، مولانا حافظ خلیل احمد سہارن پوری، مولانا محمد اسحاق امرتسری مہاجر مدنی، مولانا غلام رسول ہزاروی الدیوبندی، مولانا حبیب الرحمن دیوبندی، مولانا عبد العلی محدث۔ مولانا حکیم محمد حسین۔

دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر آپ گنگوہ تشریف لے گئے جہاں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے شمع رشد و ہدایت روشن کر رکھی تھی۔ یہاں سے آپ نے حدیث کی سند حاصل کر کے دہلی کے مدرسہ امینیہ میں، جو اُن کے دوست مولانا امین الدین صاحب نے قائم کیا تھا، مدرسِ اعلیٰ مقرر ہوئے اور بارہ برس تک درس و تدریس میں مصروف رہے۔

دہلی سے کشمیر واپس آئے۔ سینکڑوں طالب علم آپ کی شاگردی میں رہے اور ہزاروں نے ہدایت پائی جس کے باعث آپ عوام الناس میں نہایت ہی عزت و تکریم کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے۔ ویسے بھی آپ کی علمی اور مذہبی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی مگر طبیعت میں درویشی و قلندری بدستور تھی۔ ۱۳۲۲ھ میں آپ بارہ مولا (کشمیر) کے مخیر رئیس خواجہ عبد الصمد ککرو مرحوم (والدِ محترم خواجہ حبیب اللہ ککرو و خواجہ عنایت اللہ ککرو) کی رفاقت میں بلادِ اسلامیہ کی سیر کو گئے اور مصر، حجاز، طرابلس اور بصرہ کی سیاحت کی۔ وہاں کے علما و فضلا آپ کی ذہانت و فطانت اور علم و مطالعہ سے بے حد متاثر ہوئے۔ اس سفر کے دوران میں آپ نے اسلامی ملکوں کے بعض مستند عالموں سے بھی دینی علوم پر سندات حاصل کیں۔ سید

اسد اللہ شاہ دوارکی راوی ہیں کہ جب آپ مصر میں پہنچے تو آپ نے وہاں ایک نادر دینی کتاب دیکھی جس کا دنیا بھر میں صرف ایک ہی نسخہ تھا۔ شاہ صاحب نے لائبریرین سے کتاب پڑھنے کی درخواست کی جو اس نے منظور کر لی۔ آپ نے کتاب کو بغور پڑھا اور پھر اپنی بے پناہ قوتِ حافظہ اور یادداشت کی بنا پر تحریر کر لیا۔ اصل کتاب سے جب اس کا متن ملایا گیا تو اس میں ایک غلطی بھی نہ تھی۔

کشمیر واپس آکر آپ نے اپنے رفیق خواجہ عبدالصمد ڈکر و مرحوم کی تحریک اور خواہش پر بارہ مولا میں "مدرسہ فیضِ عام" کی بنیاد رکھی اور تین سال وہاں درس دیا۔ مولانا مرحوم کی ہمیشہ یہ خواہش اور کوشش رہی کہ کشمیری خوابِ غفلت سے بیدار ہوں۔ انھوں نے اہلِ وطن کو درسِ دین بھی دیا اور درسِ حریت بھی۔ مگر حالات بتاتے ہیں کہ انھیں اپنے ہم وطنوں سے مایوسی ہوئی اور پھر دیوبند واپس تشریف لے گئے۔ اس ضمن میں مولانا محمد الدین فوق مرحوم لکھتے ہیں:

"جب میں نے انھیں کشمیر میں رہنے اور دیوبند میں جانے سے روکا تو فرمایا۔ کوئی ایسا آدمی پیدا کیجیے جو ہماری باتیں سن سکے۔ ہمیں خدمتِ وطن سے تو کوئی انکار نہیں"[۱]

اپنی قابلیت اور عبادت گزاری کے سبب مولانا نے جلد ہی اپنا مقام علمائے کرام کی صفِ اول میں پیدا کر لیا۔ ان کے ہم عصر اُن کی دینی فضیلت اور علمی صلاحیت کے اتنے قائل ہوئے کہ کسی نے "بخاری وقت" کے نام سے پکارا اور کسی نے "ابوحنیفہ ثانیؒ" کے لقب سے۔ اس سلسلہ میں اُن کے ایک ہم عصر نامور محدث علامہ زاہد بن الحسن الکوثری کی شہادت یہ ہے:

"علامہ ابنِ الہمام (متوفی ۸۶۱ھ) کے بعد انور شاہ صاحب کے پایہ کا کوئی دوسرا شخص پیدا نہیں ہوا جو متنِ حدیث سے نئے نئے مباحث و نکات کے استنباط و استخراج کی اہلیت رکھتا ہو۔ اور یہ وقفہ شاہ صاحب اور ابنِ ہمام کے درمیان کوئی معمولی وقفہ نہیں ہے"[۲]

مولانا مرحوم نہایت ہی خوبرو اور وجیہہ تھے۔ قوتِ حافظہ بے پناہ تھی۔ شخصیت جاذبِ نظر بھی تھی اور پُرکشش بھی۔ جو کوئی ایک بار دیکھ لیتا پھر نظریں چہرہ سے نہ اٹھاتا۔ باتیں بہت کم کرتے تھے لیکن ہر بات سے وقار ٹپکتا تھا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنتے تھے۔ کھانے پینے کے معاملے میں جو

---

[۱] مشاہیرِ کشمیر [۲] مقدمہ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح از شیخ عبدالفتاح ابوغدہ، ص ۳۰

چیز زیادہ پسند آجاتی اسے سیر ہو کر کھاتے تھے۔ طبیعت شگفتہ تھی اور جانِ محفل تھے، اپنی کم گوئی کے باوجود بڑی پیاری اور پُر لطف باتیں کرتے تھے۔ ایک بار سبق پڑھا رہے تھے کہ کہنے لگے "چلو اپنے گھر کا راستہ لو۔ بھائی شمس الدین ہی چلے گئے ہیں۔" پڑھنے والوں نے حیرانی سے پوچھا کہ کون شمس الدین؟ تو ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "جاہلو دیکھتے نہیں وہ بھائی شمس الدین رخصت ہو رہے ہیں۔" اندھیرے میں پڑھ کر کیا کرو گے۔ اس میں تو لطف نہیں آئے گا۔"

امام الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ آپ کی دین داری، علمی فضیلت اور صالح سیرت سے بخوبی آگاہ تھے اور اکثر آپ کے بارے میں سوچا کرتے تھے۔ آپ کو اس بات کا کامل یقین تھا کہ اگر کوئی عالمِ دین ان کے بعد ان کے منصبِ اعلیٰ کا اہل و مستحق ہو سکتا ہے تو وہ مولانا انور شاہ ہی ہیں۔ اس لیے چاہتے تھے کہ مولانا انور شاہ مستقل طور پر دیوبند میں ہی بس جائیں۔ تحصیل علم اور تبلیغ دین میں مولانا مرحوم اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ صرف کر چکے تھے اور اس کام میں ایسے مستغرق تھے کہ ۴۴ برس تک شادی نہ کی۔ چنانچہ اس کارِ خیر کو حضرت محمود الحسن اور مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم نے سرانجام دیا اور ان کی مساعی جمیلہ سے گنگوہ کے سادات خاندان میں شادی ہو گئی۔ اس وقت تک آپ بلا معاوضہ کام کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں ثناء الحق ایم۔ اے لکھتے ہیں:

"منتظمین نے بہت چاہا کہ آپ کم از کم اپنی بنیادی ضرورتوں کا خیال کرتے ہوئے ہی کچھ مشاہرہ قبول فرمالیں مگر آپ کسی طرح راضی نہ ہوئے اور بلا معاوضہ ہی کام کرنے کے لیے تیار ہو گئے البتہ مہتمم دار العلوم حافظ احمد صاحب کے بے حد اصرار پر آپ نے دونوں وقت ان کے ساتھ طعام میں شرکت کرنا قبول کر لیا اور دار العلوم کے احاطے میں ایک مختصر سا حجرہ جو رہائش کے لیے مل گیا اس میں یہ شیدائی علم ایک طویل عرصہ تک خود بھی علم کے اتھاہ سمندر میں غواصی کرتا رہا اور صدہا تشنگان کی پیاس بھی بجھاتا رہا۔"

۱۳۲۳ھ میں جب حضرت مولانا محمود الحسنؒ حجاز تشریف لے گئے تو صحیح بخاری کا درس آپ ہی کے سپرد ہوا اور آپ نے اس کام کو بہ طریق احسن سرانجام دیا۔ آخری عمر تک صرف ساٹھ روپیہ مہینہ تنخواہ لیتے رہے۔ "سرگزشت فوق" (غیر مطبوعہ جو محمد عبد اللہ قریشی کی تحویل میں ہے) میں لکھا ہے کہ ان کو "سید" نہ لکھا ہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ میں "سید" نہیں ہوں۔ یہاں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ اردو زبان کے مشہور

اعر، ادیب اور ڈرامہ نگار آغا محمد شاہ حشر کاشمیری بھی آپ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اسی طرح کشمیر کے مشہور سیاسی رہنما مولانا محمد سعید مسعودی کا سلسلۂ نسب بھی مولانا انور شاہ کاشمیری کے بزرگوں سے ملتا ہے۔ ن دونوں بزرگوں نے بھی اپنے آپ کو سید نہیں کہا۔ مولانا انور شاہ کو اہلِ جموں و کشمیر سے بے حد محبت و عقیدت تھی۔ ایک بار آپ نے کشمیریوں کے ایک وفد کی قیادت بھی فرمائی تھی جو نواب سر سلیم اللہ آف ڈھاکہ کے پاس گیا تھا۔ مولانا مرحوم نے نواب مرحوم کی خدمت میں بزبانِ عربی جو سپاسنامہ پڑھا وہ تاریخ سیاست اور زبان کا اعلیٰ اور نادر نمونہ مانا جاتا ہے۔ ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۲ء میں آپ اپنے والدِ ماجد اور دیگر اہلِ کنبہ سے ملاقات کی غرض سے کشمیر گئے اور مختلف ضلعوں میں اپنے مواعظ سے لوگوں کو مستفیض فرمایا۔ آپ کے دوسرے چاروں بھائی کشمیر میں دینِ اسلام کے مبلّغ رہے، انھوں نے بھی تازیست درس و تدریس کا پیشہ اختیار رکھا۔ آپ کے ایک فرزند دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہیں۔ اُن کا اسمِ گرامی ابنِ الانور سید محمد اظہر شاہ قیصر ہے اور وہ دارالعلوم کے رسالہ کے مدیر ہیں۔

مولانا انور شاہ ان خوش نصیب لوگوں میں سے تھے جن کی علمی و دینی عظمت کا اعتراف ان کے ہم عصروں نے بھی کیا ہے اور غیر ملکی مشاہیرِ دین و ملت نے بھی۔ اس ضمن میں علامہ رشید رضا مدیر "المنار"، مصر نے لکھا ہے کہ جب میں دارالعلوم دیوبند میں آیا تو مولانا انور شاہ کی "مسلکِ حنفیہ اور اصولِ سیاسی" پر عربی زبان میں مدلّل اور جامع تقریر سُن کر بے حد متاثر ہوا اور میری زبان سے بار بار یہ جملے نکلتے تھے کہ "بخدا میں نے اس مرد کی مانند کسی کو کبھی نہیں دیکھا۔"

علامہ رشید رضا جو شافعی المذہب تھے مولانا کی تقریر اور دارالعلوم کے نصاب سے بے حد متاثر ہوئے اور جاتی دفعہ یہ کہہ گئے کہ اگر میں اس دارالعلوم کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے نہایت مایوس واپس جاتا۔ اس دارالعلوم نے بتا دیا ہے کہ ہندوستان میں بھی علومِ عربیہ اور تعلیماتِ مذہبیہ اعلیٰ پیمانہ پر موجود ہیں۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے فرمایا: ایک انگریز کا قول تھا کہ اسلام کی حقانیت کا اس لیے قائل ہوا کہ غزالی جیسا مدبر اسلام کو حق سمجھتا ہے۔ میں کہتا ہوں جب انور شاہ ایسا محقق اور مدقق عالم اسلام کو حق سمجھتا ہے تو میرے نزدیک اسلام کی حقانیت کی یہ ایک بڑی دلیل ہے۔"

شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں:

"اگر ہماری آنکھوں نے شاہ صاحب کا مثل نہیں دیکھا تو ہمیں یقین ہے کہ شاہ صاحب کی آنکھ نے

نے بھی شاہ صاحب کا مثل نہیں دیکھا۔ وہ امام ابوالحسن کی زبان اور ترجمان ہیں اور اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ تم نے شیخ تقی الدین ابن دقیق العید اور حافظ ابن حجر عسقلانی کو دیکھا ہے تو میں کہہ دوں گا کہ ہاں میں نے انور شاہ کی ذات میں سب کو دیکھا ہے۔"

ایک اور مقام پر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:

"نہ تو دنیا کی آنکھوں نے ان کی نظیر دیکھی اور نہ خود انھوں نے اپنے کسی ثانی اور مماثل کو دیکھا۔"[۴۳]

مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

"مرحوم کم سخن لیکن وسیع النظر عالم تھے۔ اُن کی مثال اس سمندر کی سی تھی جس کی اوپر کی سطح ساکن لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گراں قدر خزانوں سے معمور ہوتی ہے۔ وہ وسعتِ نظر، قوتِ حافظہ میں اس عہد میں بے مثال تھے۔ علومِ حدیث کے حافظ اور نکتہ شناس، علوم و آداب میں بلند پایہ، معقولات میں ماہر، شعر و سخن سے بہرہ مند اور زہد و تقویٰ میں کامل تھے اور اللہ تعالیٰ اپنی نوازشوں کی جنت میں ان کا مقام اعلیٰ کرے کہ مرتے دم تک علم و معرفت کے اس شہید نے قال اللہ و قال الرسولؐ کا نعرہ بلند رکھا۔ مرحوم معلومات کے دریا، حافظہ کے بادشاہ اور وسعتِ علمی کی نادر مثال تھے۔ ان کو زندہ کتاب خانہ کہنا چاہیے۔ شاید ہی کوئی کتاب مطبوعہ ہو یا قلمی اُن کے مطالعہ سے بچی ہو۔"

حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب مہتمم دار العلوم دیوبند لکھتے ہیں:

"آپ کے یہاں رَدِّ قادیانیت کا خاص اہتمام تھا اور اس فتنہ کو اعظم الفتنین شمار کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں کئی معرکہ آرا کتابیں بھی تصنیف فرمائیں اور بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے تلامذہ سے بھی لکھوائیں۔ اس بارے میں بڑے شغف کے ساتھ لکھنے والوں کو علمی مدد دیتے تھے اور کوئی بھی اپنا نوشتہ لاکر سناتا تو غیر معمولی خوشی کا اظہار فرماکر دعائیں دیتے تھے۔ تقریباً ۱۳۲۲ھ سے آپ نے دار العلوم میں درس کا آغاز فرمایا۔ ۱۳۳۴ھ سے ۱۳۴۵ھ تک آپ دار العلوم کے صدر مدرس رہے۔ اس دوران میں تقریباً ایک ہزار طلبہ نے آپ سے استفادہ کیا جن میں سے آپ کے دورِ صدر مدرسی میں ۹۰۰ طلبا نے درسِ حدیث لیا اور اس فنِ پاک کو تقریراً و تحریراً اور درساً و تدریساً دُور دُور تک پھیلایا۔"[۴۴]

---

[۴۳] فتح الملہم، جلد اوّل، ص ۳۳۵

[۴۴] دار العلوم (دیوبند) فروری ۱۹۷۱ء، ص ۲۱

علامہ اقبالؒ سے تعلقات

علامہ اقبالؒ کو حضرت انور شاہؒ سے بہت عقیدت و ارادت تھی اور اکثر دینی امور میں آپ ہی سے رجوع فرماتے تھے بلکہ کئی موقعوں پر علامہ اقبالؒ نے مولانا انور شاہؒ کی علمی، دینی اور فقیہی قابلیت کا نہ صرف اعتراف کیا بلکہ ان سے رہبری اور رہنمائی بھی حاصل کی۔ مولانا عبدالصمد صارم لکھتے ہیں :

"ڈاکٹر اقبال مرحوم خود بڑے پائے کے فلسفی تھے۔ فلسفۂ قدیم و جدید پر ان کی یکساں نظر تھی علوم جدیدہ میں ان کو کمال حاصل تھا لیکن وہ بھی شاہ صاحب کی نگاہِ التفات کے خواست گاروں میں سے تھے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے شاہ صاحب سے بہت کچھ فیض حاصل کیا اور اس کا اعتراف انھوں نے خود بھی کیا ہے"[۵۵]

مولانا ضیاء الرحمن فاروقی اپنے ایک مضمون "دیوبند کی عہد ساز شخصیتیں" میں لکھتے ہیں :

"انھی کے متعلق علامہ اقبال نے کہا تھا اس وقت روئے زمین پر انور شاہ سے بڑا کوئی عالم نہیں"[۵۶]

علامہ اقبالؒ اور مولانا انور شاہ مرحوم کے تعلقات کا باقاعدہ آغاز اکتوبر ۱۹۲۱ء میں ہوا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں :

"ہندوستان میں سیاسی طور پر ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۲ء تک کا زمانہ بڑے ابتلا کا زمانہ تھا۔ چنانچہ جمعیۃ العلماء ہند نے تجویز کیا کہ ایک عام جلسہ ان سیاسی حالات کے تحت کیا جائے۔ اس کے روحِ رواں مولانا عبدالقادر قصوری تھے اور یہ عظیم الشان جلسہ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں لاہور کے برڈلا ہال میں منعقد ہوا۔ راقم نے اتنے علمائے دین کا مجمع پھر نہیں دیکھا۔ اس کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد نے کی تھی مجھے خوب یاد ہے کہ اس جلسہ کے افتتاح پر قرأت مولانا طاہر دیوبندی نے کی تھی اور تحریک صدارت کی تائید میں کئی علما نے تقریریں کی تھیں مگر وہ تقریر جو مرحوم شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا فاخر کانپوری نے کی تھی، شاہکار تھی۔ خطبۂ صدارت کا کچھ حصہ مولانا ابوالکلام آزاد نے خود کچھ حصہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے اور باقی مولانا عبدالحلیم انصاری نے پڑھا تھا۔ اسی جلسہ میں اول مرتبہ میں نے علامہ اقبال اور علامہ انور شاہ کاشمیری کا تعارف کرایا تھا۔ اس کے بعد اقبال اور مولانا انور شاہ کی متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ اقبال کی شدید خواہش تھی کہ

---

[۵۵] سیرت انور شاہ کاشمیری، ص ۴۰

[۵۶] دارالعلوم، فروری ۱۹۷۶ء

لاہور میں کسی مستند عالم کو مستقل قیام کی دعوت دی جائے تاکہ وہ خود اور اہل لاہور اس سے استفادہ کرسکیں۔ اقبال کے نزدیک لاہور میں ایک متنفس بھی ضروریاتِ اسلامی سے آگاہ نہیں تھا اور پنجاب علمی طور پر بانجھ تھا۔ اکبر الہ آبادی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

"یہاں لاہور میں ضروریاتِ اسلامی سے ایک متنفس بھی آگاہ نہیں۔ یہاں انجمن، کالج اور فکرِ مناسب کے سوا اور کچھ نہیں۔ پنجاب میں علما کا پیدا ہونا بند ہوگیا ہے۔ صوفیا کی دکانیں ہیں۔ مگر وہاں سیرتِ اسلامی کی متاع نہیں بکتی۔"

ایسے میں اقبالؒ کی نظرِ انتخاب برِعظیم پاک و ہند میں دو شخصیتوں پر پڑی جنھیں لاہور میں مستقل قیام کی دعوت دی جاسکے۔ ایک سید سلیمان ندویؒ اور دوسری مولانا انور شاہ کاشمیریؒ، لیکن بدقسمتی سے دونوں بزرگ لاہور نہ آسکے ؎[۵]

اس ضمن میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں :

"ایک مرتبہ علامہ انور شاہ صاحب لاہور میں تشریف لائے۔ وہ راقم کے مکان کے قریب تکیہ سادھواں میں پیر عبدالغفار شاہ (م ۲ر جمادی الثانی ۱۳۴۰ھ) کے ہاں مہمان تھے۔ ان کی آمد سے پہلے علامہ اقبالؒ نے انجمن اسلامیہ اور انجمن حمایتِ اسلام سے معاملہ فہمی کرلی تھی کہ اگر آپ یہاں تشریف لے آئیں تو آپ خطیب بادشاہی مسجد اور صدر اسلامیہ کالج میں علومِ دینِ اسلام کے سربراہ ہوں گے۔"

مولانا انور شاہ کاشمیری مارچ ۱۹۲۵ء میں جب "انجمن خدام الدین" کے اجلاس میں شرکت کے لیے لاہور آئے تو علامہ اقبال نے ۱۳ر مارچ ۱۹۲۵ء کو انھیں حسبِ ذیل خط لکھا :

مخدوم و مکرم حضرت قبلہ مولانا! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

"مجھے ماسٹر عبداللہ سے ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ انجمن خدام الدین کے جلسہ میں تشریف لائے ہیں اور ایک دو روز قیام فرمائیں گے۔ میں اسے اپنی بڑی سعادت تصوّر کروں گا اگر آپ کل شام اپنے دیرینہ مخلص کے ہاں کھانا کھائیں۔ جناب کی وساطت سے حضرت مولوی حبیب الرحمٰن صاحب، قبلہ عثمانی، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب اور جناب مفتی عزیزالرحمٰن صاحب کی خدمت میں بھی یہی

---

۵ چٹان، ۱۲ جنوری ۱۹۷۵ء

التماس ہے۔ مجھے امید ہے کہ جناب اس عریضے کو شرفِ قبولیت بخشیں گے۔ آپ کو قیام گاہ سے لانے کے لیے سواری یہاں سے بھیج دی جائے گی۔

اقبال

اس دعوت میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولوی حبیب الرحمن لدھیانوی بھی شریک تھے۔ حضرت مولانا انور شاہ نے ۱۹۲۶ء میں دارالعلوم دیوبند سے استعفیٰ دے دیا۔ ان کے استعفیٰ کے پس منظر کو عبدالصمد صارم یوں بیان کرتے ہیں:

"۱۳۳۳ھ میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے قید ہو جانے کے بعد شاہ صاحب کو دارالعلوم کا صدر مدرس مقرر کیا۔ دارالعلوم کی انتظامیہ نے بہت سے اصلاحی کام کیے لیکن پھر بھی کچھ لوگ ایسے تھے جو مزید اصلاحات کے خواہاں تھے۔ ان لوگوں میں علامہ شبیر احمد عثمانی کے علاوہ خود شاہ صاحب بھی شامل تھے۔ یہ تحریک اصلاحات انتظامیہ کو منظور نہ تھی۔ چنانچہ جب شاہ صاحب نے انتظامیہ کی یہ ہٹ دھرمی دیکھی تو صدر مدرس کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا جو انتظامیہ نے منظور کر لیا۔ اور اس کے بعد شاہ صاحب جامعہ اسلامیہ ڈابھیل تشریف لے گئے۔ یہاں اس بات سے بحث نہیں کہ شاہ صاحب کا استعفیٰ دینا ٹھیک تھا یا انتظامیہ کا استعفیٰ منظور کرنا، بحث اس بات سے ہے کہ جب شاہ صاحب نے انتظامیہ کی ہٹ دھرمی کو غلط سمجھا تو انھوں نے دارالعلوم کی صدر مدرسی سے (جو ایک بہت بڑا قابلِ عزت عہدہ ہے) بھی استعفیٰ دینے سے دریغ نہ کیا۔ اس سے آپ کی خودداری کا بخوبی پتہ چلتا ہے"[۵۸]

جہاں تک حضرت مولانا انور شاہؒ کے استعفیٰ اور علامہ اقبالؒ کے انھیں لاہور میں بلانے کا تعلق ہے اس سلسلہ میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں:

"دارالعلوم دیوبند میں اختلافات کے باعث جب حضرت الاستاد نے اپنے عہدہ صدر الاساتذہ سے استعفیٰ دیا تو یہ خبر اخبارات میں چھپی، اس کے چند روز بعد ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمانے لگے کہ آپ کا اور دوسرے مسلمانوں کا جو بھی تاثر ہوا ہمیں بہرحال شاہ صاحب کے استعفیٰ

---

۵۸ سیرت انور شاہ کشمیری، ص ۲۰

کی خبر پڑھ کر بہت خوش ہوا ہوں ۔ میں نے تعجب سے عرض کیا ۔
" کیا آپ کو دارالعلوم دیوبند کے نقصان کا کچھ ملال نہیں ؟ فرمایا کیوں نہیں ؟ مگر دارالعلوم کو صدر المدرسین اور بھی مل جائیں گے اور یہ جگہ خالی نہ رہے گی لیکن اسلام کے لیے جو کام میں شاہ صاحب سے لینا چاہتا ہوں اس کو سوائے شاہ صاحب کے کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا ۔ اس کے بعد انھوں نے اس اجمال کی تفصیل یہ بیان کی کہ آج اسلام کی سب سے بڑی ضرورتِ فقہ کی جدید تدوین ہے جس میں زندگی کے سینکڑوں ہزاروں مسائل کا صحیح حل پیش کیا گیا ہو جن کو دنیا کے موجودہ قومی اور بین الاقوامی، سیاسی، معاشی اور سماجی احوال و ظروف نے پیدا کر دیا ہے ۔ مجھ کو پورا یقین ہے کہ اس کام کے لیے میں اور شاہ صاحب دونوں مل کر ہی کچھ کر سکتے ہیں ۔ ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی شخص اس وقت عالمِ اسلام میں ایسا نظر نہیں آتا جو اس عظیم ذمہ داری کا حامل ہو سکے ۔ پھر فرمایا یہ مسائل کیا ہیں ؟ اور ان کا سرچشمہ کہاں ہے ؟ میں ایک عرصہ سے اُن کا بڑے غور سے مطالعہ کر رہا ہوں ۔ یہ سب مسائل میں شاہ صاحب کے سامنے پیش کروں گا اور ان کا صحیح اسلامی حل کیا ہے ؟ یہ شاہ صاحب بتائیں گے ۔ اس طرح ہم دونوں کے اشتراک و تعاون سے فقہ جدید کی تدوین عمل میں آجائے گی ۔"

عبدالرشید ارشد صاحب مولانا عبدالحنان ہزاروی کی زبانی لکھتے ہیں :

" جب علامہ شاہ صاحب نے دارالعلوم دیوبند سے استعفا دے دیا ۔ میں ان دنوں لاہور آسٹریلیا جامع مسجد میں خطیب تھا ۔ ڈاکٹر صاحب نے دیوبند ایک تفصیلی تار دیا جس میں شاہ صاحب سے درخواست کی گئی تھی کہ اب آپ لاہور تشریف لے آئیں اور یہیں قیام فرمائیں، جوابی تار تھا جس کا کوئی جواب نہ آیا ۔ جس پر ڈاکٹر صاحب نے مجھ کو دیوبند بھیجا کہ تم جا کر زبانی عرض کرو ۔ میں گیا تو معلوم ہوا کہ شاہ صاحب کو وہ تار اس وقت دیا گیا جب ڈابھیل والوں نے اصرار کر کے وہاں تشریف لے جانے پر رضامند کر لیا تھا ۔ میں ملا تو فرمایا ۔ افسوس کہ آپ کا پیغام بعد میں ملا میں ڈابھیل والوں سے وعدہ کر چکا۔"[9]

علامہ اقبالؒ اور مولانا سید انور شاہؒ میں باقاعدہ خط و کتابت بھی ہوتی رہی ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ

---

۹ چٹان لاہور، جنوری ۱۹۷۵ء

خط و کتابت دینی امور کے بارے میں ہی ہوتی ہوگی۔ اس ضمن میں قاری محمد طیب لکھتے ہیں:

(اقبال) کے آٹھ آٹھ صفحات کے خطوط سوالات و شبہات سے پُر آتے تھے اور حضرت ان کے شافی جوابات لکھتے۔"

علامہ اقبالؒ شاہ صاحبؒ کی کتابوں کو نہایت دلچسپی اور غور و فکر سے پڑھتے تھے۔ ادھر شاہ صاحب کی جب کوئی نئی تصنیف چھپ کر آتی تو وہ بھی علامہ اقبال کے پاس بھیجتے تھے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں:

"شاید اس واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ حضرت استاد کا ایک منظوم رسالہ "حدوث عالم" کی بحث پر ہے۔ یہ رسالہ چھپ کر آیا تو اس کا ایک نسخہ حضرت الاستاذ نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے پاس بھی تحفہ ارسال فرمایا۔ ایک صحبت میں فرمایا کہ میں تو مولانا انور شاہ کا رسالہ پڑھ کر دنگ رہ گیا ہوں کہ رات دن قال اللہ اور قال الرسولؐ سے واسطہ رکھنے کے باوجود فلسفہ میں بھی ان کو اس درجہ درک و بصیرت اور اس کے مسائل پر اس قدر گہری نگاہ ہے کہ حدیثِ عالم پر اس رسالہ میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے حق یہ ہے کہ آج یورپ کا بڑے سے بڑا فلسفی بھی اس مسئلہ پر اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا۔"[۱۶]

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال نے مولانا انور شاہؒ کی علمی و دینی بصیرت کو بے حد سراہا اور ان سے کئی امور پر رہنمائی بھی حاصل کی۔ انھوں نے ۱۹۲۸ء میں اورینٹل کانفرنس لاہور کے شعبہ عربی و فارسی کے صدارتی خطبہ میں لکھا:

"لیکن جدید ریاضیات کے اہم ترین تصورات میں سے ایک تصور کا یہ مختصر حوالہ بالا میرے ذہن کو عراقی کی تصنیف "غایۃ الامکان فی درایۃ المکان" کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ مشہور حدیث "لا تسبوا الدھر ان الدھر ھو اللہ" میں دہر (عقبیٰ TIME) کا جو لفظ آیا ہے اس کے متعلق مولوی انور شاہ صاحب سے جو دنیائے اسلام کے جید ترین محدثین وقت میں سے ہیں، ان سے میری خط و کتابت ہوئی۔ اس مراسلت کے دوران میں مولانا موصوف نے مجھے اس مخطوطے کی طرف رجوع کرایا اور بعد ازاں میری درخواست پر از راہِ عنایت مجھے اس کی ایک نقل ارسال کی۔"

علامہ اقبال اور مولانا انور شاہ کی آخری ملاقات اگست ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب مولانا انور شاہ "مقدمہ بہاولپور" کے سلسلہ میں بہاولپور جا رہے تھے۔ اس سفر میں انھوں نے دو روز لاہور میں قیام کیا۔ ان ایام میں مولانا انور شاہ جامع مسجد آسٹریلیا میں صبح کی نماز کے بعد درس قرآن دیتے تھے۔ علامہ اقبالؒ اس موقعہ پر موجود ہوتے تھے۔ مولانا انور شاہ صاحب ڈابھیل میں بیمار ہو کر دیوبند چلے گئے جہاں ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء (۱۳۵۱ھ) کو آپ کا انتقال ہوا اور اس طرح :

دست بے داد اجل سے بے سروپا ہو گئے فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

برکت علی اسلامیہ ہال لاہور کے تعزیتی جلسے میں علامہ اقبال نے فرمایا :

"اسلام کی اِدھر کی پانچ سو سالہ تاریخ شاہ صاحب کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔"

آپ نے اپنی تقریر کا اختتام اپنے اس شعر پر کیا :

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

علامہ اقبال اور مولانا انور شاہؒ کے دینی عقائد میں یگانگت تھی۔ اور طبیعتیں بھی آپس میں ملتی تھیں۔ سیرت انور شاہ" اور سوانح "سید انور شاہ" کے مطالعہ سے جو بات شاہ صاحب کی سیرت و کردار کے بارے میں اجاگر ہوتی ہیں۔ وہ اُن کا مطالعہ سے عشق۔ بے پناہ حافظہ۔ حسن صورت، لطائف و مزاح، خودداری رواداری۔ خدمتِ مذہب اور عشقِ رسولؐ ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ حضرت علامہ اقبال کی ذاتِ گرامی میں بھی یہ چیزیں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ البتہ اگر ان دو شخصیتوں میں کوئی اختلاف تھا تو وہ ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں تھا۔

چونکہ دیوبند میں زیادہ اثر و رسوخ امام الہند محمود الحسن اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا تھا اس لیے یہ دونوں بزرگ "متحدہ قومیت" کے نظریہ کو ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کے لیے بہتر سمجھتے تھے مگر علامہ اقبالؒ متحدہ قومیت کے قائل نہ تھے۔ یعنی ان کا نقطۂ نظر "جداگانہ قومیت" کا تھا۔ بہرحال واقعات اس امر کے شاہد ہیں کہ دیوبند کے بیشتر علما کرام نے علامہ شبیر احمد عثمانی کی زیرِ قیادت تحریکِ پاکستان میں حصہ لیا اور اقبال کی ہم نوائی کی۔

علامہ اقبال اور مولانا انور شاہؒ مسئلہ ختم نبوت پر بھی کامل یقین رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں علامہ اقبالؒ کی جدوجہد کی اس سے سب آگاہ ہیں اور مولانا انور شاہ صاحب نے علمی اور دینی میدان میں جو کچھ کیا

ہے وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے یہاں پر اس مسئلہ پر اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ انھوں نے اس فتنہ کو ختم کرنے کے لیے کئی رسائل لکھے اور کتابیں تصنیف کیں۔ اس سلسلہ میں مولانا بدر احسن درجھنگوی فاضل دیوبند لکھتے ہیں:

"علامہ سید محمد انور شاہ کو اس فتنہ کی خطرناکی کا شدید احساس تھا اور اس وجہ سے مسلسل چھ مہینے تک انتہائی کرب اور قلبی اذیت میں مبتلا رہے حتیٰ کہ نیند تک اچاٹ ہو گئی تھی جس کا صحت پر بھی ناخوشگوار اثر مرتب ہونے لگا تھا۔"[۱۱]

کچھ ایسی ہی کیفیت علامہ اقبالؒ کی بھی تھی۔

مولانا انور شاہؒ نے صحیح بخاری کی چار جلدوں میں شرح لکھی اور سرور کائنات کی مدح میں عربی زبان میں کئی قصائد قلم بند کیے۔ آپ عربی اور فارسی زبانوں کے باکمال شاعر تھے اور ان دونوں میں یکساں روانی کے ساتھ شعر بھی کہتے تھے اور نثر میں یگانہ روزگار تھے۔ آپ نے کئی کتابیں تحریر کی ہیں جن میں مندرجہ ذیل بہت مشہور ہیں:

۱۔ عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام۔ ۲۔ اکفار الملحدین فی ضروریات الدین۔
۳۔ فصل الخطاب فی مسئلہ ام الکتاب ۴۔ کشف الستر عن صلاۃ الوتر
۵۔ نیل الفرقدین فی مسئلہ رفع الیدین ۶۔ بسط الیدین لنیل الفرقدین
۷۔ ضرب الخاتم علی حدوث العالم ۸۔ سہم الغیب فی کبد اہل الریب
۹۔ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح ۱۰۔ خاتم النبیین
۱۱۔ تحیۃ الاسلام فی حیوٰۃ عیسیٰ علیہ السلام ۱۲۔ ازلۃ الریب فی الذب عن قرۃ العین۔

آپ کے شاگردوں میں مولانا حفظ الرحمٰن، قاری طیب صاحب، مناظر احسن گیلانی، مفتی محمد شفیع، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا محمد یوسف بنوری، حامد الانصاری، غازی محمد میاں، محمد منظور نعمانی، قاضی زین العابدین میرٹھی، سید اختر حسین، میر واعظ مولوی یوسف شاہ مرحوم معروف و ممتاز ہیں۔

حضرت علامہ اقبال نے اپنی ایک نظم — "ملا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض" — میں لکھا ہے:

بیدار ہوں دل جس کی فغانِ سحری سے
اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب
اے وادیٔ لولاب[۱۲]

---

[۱۱] چٹان، ۲۶ مئی ۱۹۷۵ء [۱۲] ارمغانِ حجاز